Article

Sketch Writings in 21st Century: Technical and Stylistical Perspective

اکیسویں صدی میں خاکہ نگاری: فنی و اسلوبی تناظر

Dr Sabah Abdul Moiz*[1]
Department of Urdu, Al-Azhar University, Egypt
Dr Arif Sadique*[2]
SST Government High School Haiderabad Town , Sargodha

[1]-ڈاکٹر صباح عبد المعز
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جامعہ الازہر، مصر
[2]-ڈاکٹر عارف صدیق
ایس ایس ٹی، گورنمنٹ ہائی سکول حیدر آباد ٹاؤن، سرگودھا

Correspondanance: arifsiddique242@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 03-02-2024
Accepted:20-03-2024
Online:28-03-2024

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract:The realm of Urdu literature is graced with many illustrious sketch writers who have contributed significantly to the genre. Ismat Chughtai, renowned for her feminist perspective and poignant storytelling, stands out as a pivotal figure. Her works often delve into the intricacies of women's lives, portraying their struggles and resilience with a masterful touch. Another pioneer of Urdu pen sketches is Mirza Farhatullah Baig, whose work 'Dr Nazeer Ahmed Ki Kahani Kuch Meri Aur Kuch Un Ki Zabani' is celebrated as Urdu's first pen sketch, offering a humorous yet insightful look into the life of his teacher. The list also includes names like Maulwi Abdul Haq and Ashraf Saboohi, whose sketches capture the essence of their subjects with a blend of humor and depth. Saadat Hasan Manto, though more famous for his short stories, also penned sketches that are revered for their sharp critique and reflection of society. These writers, with their unique styles and

perspectives, have enriched Urdu literature and continue to inspire readers and writers alike. Their legacy in sketch writing is a testament to the power of words in painting vivid portraits of life and humanity. In this article effort is made to analyse the sketches of 21st century in the perspective of technique and stylistics

KEYWORDS: Sketch Writings, 21st century, Farhat ullah Baig, techniques, Stylistics , Literature.

اکیسویں صدی تغیرات کی صدی ہے۔ ہر دم بدلتا ہوا سیاسی، سماجی اور تہذیبی منظر نامہ اس صدی کا طرۂ امتیاز بنتا چلا جارہا ہے۔ اس صدی میں جہاں سیاسی اور سماجی حوالے سے دنیا بھر میں تبدیلیاں سامنے آئیں وہاں ادبی منظر نامہ میں بھی تغیر پیدا ہوا۔ اس تغیر کے نتیجے میں فکری اور موضوعاتی سطح پر تبدیلیاں آنے کے ساتھ ساتھ فن اور اسلوب میں بھی نئے نئے تجربات سامنے آئے۔ خاکہ نگاری کے اسلوب کو دیکھا جائے تو خاکہ نگار ایک کامیاب خاکہ لکھنے کے لیے پس منظر ، مکالمہ، تمثال، استعارہ اور دیگر وسیلوں کا استعمال کرتا ہے جو اس کے فن کارانہ عزم کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ ان کے استعمال سے کسی بھی شخصیت کا نقشہ کھینچ کر قاری کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے جس کی وجہ سے قاری اس شخصیت سے روشناس ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے علمی، ادبی اور سماجی کارناموں سے بھی آشنا ہوتا چلا جاتا ہے۔ قاری اور تخلیق کار کے درمیان رشتے کی مضبوطی کے لیے بھی اسلوب کی خاص اہمیت ہے۔ خاکہ نگار کا اسلوب قاری تک درست معنوں میں ابلاغ کا ذریعہ نہیں بن رہا تو بہت جلد خاکہ نگار اور قاری کے درمیان رشتے میں دراڑیں پڑ جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ خاکہ نگار کو اپنے اسلوب پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کے اور قاری کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم رہے۔

اکیسویں صدی کے نمائندہ خاکہ نگاروں کے لکھے ہوئے خاکوں کے فن اور اسلوب کو دیکھا جائے تو یہاں صورت حال خاصی تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔ بہت سے خاکہ نگار ایسے ہیں جنھوں نے اکیسویں صدی میں خاکہ نگاری کے بعض روایتی حربوں اور فن سے احتراز کرتے ہوئے نئی راہیں بھی تلاش کی ہیں۔ ان خاکوں کے حوالے کہا جا سکتا ہے کہ روایتی خاکہ نگاری میں سراپا نگاری یا حلیہ نگاری کو خاص عمل دخل ہوتا تھا لیکن جدید عہد میں یہ عمل دخل کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے اکثر خاکوں میں سراپا نگاری یا حلیہ نگاری پر توجہ نہیں دی گئی۔

اسلوب کسی بھی شخصیت کی تہذیبی تربیت، ذہانت اور تخلیقی چستی کا غماز ہوتا ہے۔ اسلوب سے ہی کسی بھی شخصیت کے تخلیقی اوصاف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اکیسویں صدی میں خاکے لکھنے والے تخلیق کاروں کے ہاں اسلوب کی سطح پر خاصی بہترین صورتحال سامنے آتی ہے جو اکیسویں صدی کی خاکہ نگاری کی روایت کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے خاکوں کے اسلوب اور فن کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ

اس صدی میں لکھنے والے اکثر خاکہ نگاروں کے ہاں اسلوب میں روانی، فصاحت، چست فقرے اور بر جستگی پائی جاتی ہے۔ ان خاکہ نگاروں کا اسلوب واضح انفرادیت کا حامل ہے جو انھیں بیسویں صدی کی خاکہ نگاری کی روایت سے منفرد کرتا ہے۔

واقعات کا بیان خاکہ نگاری کا اہم جزو ہوتا ہے۔ خاکہ نگار زیر بحث شخصیت کی زندگی سے جڑے واقعات کو بیان کرتا چلا جاتا ہے اور زندگی کے مختلف گوشوں کو عیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ واقعات کے بیان کے حوالے سے بھی اسلوب کی سطح پر خاکہ نگار کو خاص مہارت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ جو واقعات بیان کر رہا ہے وہ اس شخصیت کا درست نقشہ سامنے لائیں۔ ہر شخص کا کسی بھی واقعہ کو دیکھنے کا اپنا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ اسی طرح خاکہ نگار بھی ان واقعات کو ایک خاص نظر سے دیکھتا ہے۔ اسے اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ وہ واقعہ اس طرح بیان ہو کہ اس شخصیت کے انہدام کا باعث نہ بنے نہ ہی اس میں دروغ گوئی کا عنصر سامنے آئے۔ اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے خاکوں میں مختلف واقعات کے بیان کے حوالے سے بھی انفرادیت پائی جاتی ہے۔ اس صدی میں میڈیا کی تیز ترین ترقی کی وجہ سے واقعات براہ راست دکھائے جانے کی وجہ سے سماجی سطح پر بھی لوگوں کی زندگی کے نجی واقعات کے بیان میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اس صدی میں لکھے جانے والے خاکوں کو دیکھا جائے تو ان میں اسلوب اور فن کے حوالے سے واقعات کا بیان براہِ راست اور بے تکلفانہ انداز میں ملتا ہے۔ واقعات کے بیان میں اسلوب بھی سلیس اور رواں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں محاورات سے بھی اسلوب کو مزین کیا جاتا ہے۔

تشبیہات اور استعارات کو اسلوب کا بنیادی ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی مختلف نثر نگاروں نے اپنی تحریروں کو تشبیہات اور استعارات سے مزین کیا ہے انہوں نے اسلوب میں شائستگی اور شگفتگی پیدا کی ہے۔ اسلوب کی تشکیل میں حصہ لینے والے عناصر میں تشبیہ ایک اہم عنصر ہے۔ تخلیق کار اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے مختلف چیزوں میں مشابہت تلاش کر کے ان کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اسلوب میں حسن پیدا ہونے کے ساتھ معنوی سطح پر بھی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے اکیسویں صدی میں سامنے آنے والے خاکوں کو دیکھا جائے تو ان میں بھی اکثر لکھنے والوں نے تشبیہات اور استعارات کے ذریعے اپنے اسلوب کو دلکش بنا کر پیش کیا ہے۔

اکیسویں صدی میں سامنے آنے والے خاکہ نگاروں میں سے احمد ندیم قاسمی کے ہاں خاکہ نگاری میں اسلوب کی سطح پر تشبیہات اور استعارات کا استعمال بڑی خوب صورتی سے کیا گیا ہے۔ انھوں نے شخصیات کی زندگی کے مختلف حالات و واقعات کو بیان کرنے کے لیے جو تشبیہات استعمال کی ہیں وہ خاصی جاندار ہونے کے ساتھ ساتھ مشبہ کی پوری طرح عکاسی کرتی۔ انھوں نے امتیاز علی تاج کی طرف سے کرشن چندر کے افسانوں کی تعریف و تحسین کو یوں تشبیہاتی انداز میں بیان کیا ہے۔

> ''..... یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک ندی ہے جو گل پوش جھاڑیوں سے لدی ہوئی ایک وادی میں حد نظر تک بہے جا رہی ہے۔'' (1)

احمد ندیم قاسمی نے جو خاکے لکھے ہیں ان میں ایک خاکہ سید ضمیر جعفری کا بھی ہے۔ انھوں نے یہ خاکہ نہایت اپنائیت اور خلوص سے لکھا تھا۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں جذبات اور تاثرات کے اظہار کے لیے بھی تشبیہات کا بڑی خوب صورتی سے استعمال کیا ہے۔ انھوں نے جو تشبیہات استعمال کی ہیں ان میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو سدا کے شاداب ہیں اور قاری جب بھی پڑھتا ہے اسے ایک نیا لطف ملتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

ان کی شخصیت کو چائے سے تشبیہ دیتے تھے جو ہر موسم میں راحت بخش بھی
ہے کہ سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔" (2)

احمد ندیم قاسمی کے لکھے ہوئے خاکوں کے اسلوب کی ایک اور خوبی ان میں فارسی زبان کے اشعار اور مصرعوں کا استعمال ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے خاکہ نگاری کرتے وقت فارسی زبان کے اشعار اور مصرعوں کو خوب صورتی سے خاکوں میں استعمال کیا ہے کہ ان مصرعوں کے استعمال سے خاکوں میں ابلاغ کا کوئی مسئلہ پید انہیں ہوا اور نہ ہی قاری کو وہ مصرعے یا اشعار کہیں ٹھونسے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ انہوں نے فارسی زبان کے جو مصرعے اپنے خاکہ نگاری کے اسلوب میں استعمال کیے ہیں ان کی ایک مثال خورشید احمد کے خاکے کے اختتام پر ملتی ہے۔ قاسمی خورشید احمد کے خاکے کا اختتام ان الفاظ پر کرتے ہیں:

رفتید و لے نہ از دل ما (3)

انہوں نے ان خاکوں میں ایک ایسی ہستی کے بارے میں لکھا ہے جو برطانوی استعماریت کے خلاف ایک توانا آواز کے طور پر ابھری تھی۔ یہ ہستی اقبال شیدائی کی تھی جو ۳۱ جنوری ۱۹۴۷ء کو فوت ہوئے۔ احمد ندیم قاسمی ان کے بارے میں لکھتے ہوئے فارسی کے معروف مصرعے سے یوں اسلوب کو مزین کرتے ہیں:

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت (4)

وہ کئی جگہوں پر فارسی اور اردو کو ملا کر بھی اسلوب کو خاصا دلکش بنا دیتے ہیں جس کی وجہ سے قاری ان کے اسلوب میں ساتھ ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"قہرِ درویش بر جانِ درویش میں ان کے ساتھ چل پڑا" (5)

احمد ندیم قاسمی کے خاکہ نگاری کے اسلوب میں فارسیت کے استعمال اور تشبیہات کے ساتھ ساتھ استعارات کا استعمال بھی بڑی خوب صورتی سے ملتا ہے۔ انھوں نے ایسے استعارے استعمال کیے ہیں جو حقیقی صورت حال کو سامنے لانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ یوں استعاروں کا استعمال کرتے ہوئے تحریر کو جاذب نظر بناتے ہیں۔ ان کے بقول:

"کسی کو یہ اندازہ نہیں کہ ہماری مسکراہٹوں کے پیچھے آنسوؤں کے کتنے
آبشار بہہ رہے ہیں۔ اور ہمارے قہقہوں کے عقب میں کتنے زخم خوں فشاں
ہیں تو قصور ہمارا نہیں ہے، معترض کے ذوق نظر اور معیار کا ہے۔" (6)

احمد ندیم قاسمی کے اسلوب کی ایک اوراہم خوبی محاورات کا بر محل استعمال ہے۔انھوں نے خاکہ نگاری میں محاورات کا استعمال بھی کیاہے۔ان کے خاکے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف محاورات کے استعمال سے واقف تھے بلکہ مختلف محاورات کو متنوع انداز میں استعمال کرتے ہیں۔انھوں نے محاورات کے استعمال سے جملوں میں تاثیر پیدا کردی ہے۔ان کے ہاں محاورہ کا استعمال خاصی بے تکلفی سے ہوا ہے جس سے محاورہ تحریر سے الگ محسوس نہیں ہوتا بلکہ اسلوب میں ہی رواں رہتاہے۔وہ خدیجہ مستور پر لکھے گئے خاکے میں ان کی شخصیت کے ایک پہلو پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ اپنے عزیزوں اوردوستوں پر اکثر اوقات ایسے ایسے فقرے چست کر جاتی تھیں کہ مخاطب کو بغلیں جھانکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا تھا۔''
(7)

وہ دوسری جگہ محاورے کا استعمال یوں کرتے ہیں:

''کوئی اور اتنی پابندی کے ساتھ آزاد نظم لکھے تو اسے دانتوں پسینہ آجائے'' (8)

احمد ندیم قاسمی کی خاکہ نگاری کے اسلوب کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے تحریر کردہ خاکوں میں کہیں کہیں شعریت کا رنگ بھی نمایاں ہے۔وہ نثر لکھتے وقت بھی اشعار کا استعمال بڑے خوب صورت انداز میں کرتے ہیں۔ان کے اسلوب پر شاعرانہ پرچھائیں خاکوں کے اسلوب کا دلکش اور رواں بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ان کے خاکوں میں سے چند اشعار ملاحظہ ہو:

محبت ترک کی میں نے، گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو، زہر یہ بھی پی لیا میں نے (9)

عمر بھر چلنے کا اتنا تو صلہ پائیں گے ہم
بجھتے بجھتے چند شمعیں تو جلا جائیں گے ہم (10)

احمد ندیم قاسمی کے خاکوں میں شعروں کے خوب صورت استعمال کے ساتھ ساتھ اسلوب میں شاعرانہ رنگ آ گیاہے۔احمد ندیم قاسمی کے لکھے ہوئے خاکوں کے اسلوب کی نثر میں ایسی شعریت پائی جاتی ہے کہ قاری نثر میں نظم کی سی کیفیت محسوس کرنے لگتاہے۔وہ ظہور نظر کے خاکے میں لکھتے ہیں:

''جب بھی میں محبت کی راہ پر اپنی آگہی کی رفاقت میں عشق کی طرف بڑھتا تھا تو مجھے ظہور نظر مل جاتا تھا جو میری آگہی کا بھی حصہ دار تھا اور میری محبت کا بھی۔اس کی نظریاتی استقامت میری آگہی کی بہشت تھی اور اس کی دل زبانی اور محبوبی میری محبت کا فردوس تھی۔''(11)

احمد ندیم قاسمی کے اسلوب نے اکیسویں صدی میں خاکہ نگاری کو ایک ایسے اسلوب سے آشنا کیا ہے جو روایت اور جدت کا حسین امتزاج لیے ہوئے ہے۔ ان کے اسلوب میں کئی خوبیاں ایسی ہیں جو انہیں معاصرین میں انفرادیت عطا کرتی ہیں۔ عامر سہیل ان کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "احمد ندیم قاسمی کا اسلوب خاکہ نگاری تازہ کاری کی عمدہ مثال ہے۔ فالتو الفاظ و تراکی سے دامن بچا کر چلنا ڈرامائی صورت حال پیدا کرنا اور ہلکا پھلکا مزاح ان کے تقریباً ہر خاکے میں نظر آتا ہے۔ الفاظ کا استعمال ایسا جچا تلا ہے کہ ہر خاکہ نگار اس رشک کر سکتا ہے۔ اسلوب کی یہ .... صفات بہت کم تخلیق کاروں کو ارزانی ہوئی ہے۔"(12)

انور سدید کی خاکہ نگاری کا فنی اور اسلوبیاتی جائزہ لیتے ہیں تو اکیسویں صدی کی خاکہ نگاری کے اسلوب کے تناظر میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ انور سدید کے ہاں بھی اسلوب کی سطح پر خاصی انفرادیت ملتی ہے۔ انھوں نے خاکہ نگاری میں اسلوب کو اس صنف کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے اور اسے رواں بنانے کے لیے خاص محنت کی ہے۔ انور سدید کی خاکہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی میں ہو گیا تھا اور ان کے خاکوں کے کئی مجموعے اکیسویں صدی سے قبل بھی شائع ہو چکے تھے۔ ان کے تخلیق کردہ خاکے فکری اور موضوعاتی حوالے سے انفرادیت اور تنوع کے ساتھ اکیسویں صدی میں سامنے آنے والے خاکہ نگاری کے مجموعوں میں اسلوب کے حوالے سے بھی خاص انفرادیت کے حامل ہیں۔

انور سدید کے لکھے ہوئے خاکوں کا اسلوب رواں ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ایسی اصلیت اور جاذبیت رکھتا ہے کہ قاری کو کسی الجھن کا شکار نہیں ہوتا۔ انہوں نے بعض ایسے لوگوں کے خاکے تحریر کیے ہیں جو دنیا سے اس وقت کوچ کر چکی تھیں جب ان کا خاکہ لکھا جا رہا تھا۔ ایسی حالت میں لازمی امر ہے کہ خاکہ نگار کے ہاں ان شخصیات سے عقیدت اور احترام کا جذبہ پیدا ہو کر لوگوں کو متاثر بھی کرے۔ انور سدید کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ انھوں نے جن لوگوں کے خاکے اخیر عمر میں لکھے ان میں عقیدت اور احترام کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے اسلوب کی ایک اہم خوبی جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انھیں کسی بھی شخصیت میں جو اچھائی نظر آتی ہے وہ اسے بڑی وضاحت سے پیش کرتے ہیں۔

شریف کنجاہی ۱۳ مئی ۱۹۴۱ء کو کنجاہ گجرات میں پیدا ہوئے۔ اور ۲۱ جنوری ۲۰۰۷ء میں وفات پائی۔ انھوں نے اپنی ۶۷ سالہ زندگی کا زیادہ حصہ حصول علم، تحقیق اور شعر و شاعری میں گزارا۔ انور سدید نے ان کا خاکہ لکھا تو ان کے نام "شریف" کی ان الفاظ میں توصیف کی:

> "شخصیتوں کے حوالے سے لفظ "شریف" بڑا جاندار اور محترم معلوم ہوتا ہے۔ شریف نام اور مسمیٰ بھی شریف"(13)

انور سدید کو لفظوں کو ان کے وسیع مفہوم میں استعمال کرنے کا فن خوب آتا تھا۔ یہاں بھی انھوں '' شریف '' کو معنوی اعتبار سے وسعت دے کر جملے کی تاثیر میں اضافہ کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں کئی جگہوں پر اس فن کو برتا ہے جس کی وجہ سے ان کی خاکہ نگاری کے اسلوب میں خاصی دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔

انور سدید کے اسلوب کی ایک اور بڑی خوبی استعارے کا بہترین استعمال ہے۔ تخلیق کار کو استعارہ کا استعمال کرتے وقت خاص مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ مستعار لہ اور مستعار منہ کا آپس میں تعلق قائم نہ ہونے پائے تو جملہ کا حسن خراب ہو جاتا ہے بلکہ معنوی حوالے سے بھی جملہ کچھ کا کچھ ہو جائے گا۔ انور سدید نے خاکہ نگاری کے اسلوب میں استعارات کا استعمال خوب صورتی سے کیا ہے کہ قاری بہت جلد مفہوم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے کہیں بھی ابلاغ کے مسائل کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ وہ اپنے بزرگ ادیبوں کے لیے ستاروں کا استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ انور سدید لکھتے ہیں:

> '' یہ ادب کے وہ ستارے ہیں جو زندگی میں عقل و دانش کی روشنی پھیلاتے رہے اور دنیا سے اٹھ گئے تو ان کا غبار نور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم ان سے روشنی بے نوا حاصل کر رہے ہیں۔ آنے والی نسلیں بھی ان سے استفادہ کرتی رہیں گی۔''(14)

اکیسویں صدی میں ترقی کے باوجود معاشرے میں مجموعی طور پر گھٹن اور بے گانگی کی فضا سامنے آئی ہے اس نے سماج کے ہر فرد کو پریشان کر دیا ہے۔ سماج میں بسنے والے مختلف افراد ایک دوسرے سے انتہائی بے گانہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مفاد پرستی اور مادیت پرستی کی دوڑ نے انسان کے دل سے ایک دوسرے کی قدر اور احترام کو رخصت کر دیا ہے ۔یوں مجموعی طور پر معاشرہ بدحالی کا شکار ہے۔ ایسے سماج میں شفیق الرحمٰن جیسے مزاح نگار کا مزاحیہ ادب تخلیق کرنا سماج کے لیے نعمت ہے جو سماج کے پریشان حال لوگوں کے لبوں پہ مسکراہٹیں بکھیرتا ہے۔ انور سدید سماج کی ابتری اور شفیق الرحمٰن کی مزاح نگاری کو استعاراتی انداز میں بیان کرتے ہیں:

> ''شفیق الرحمن نے ہمارے بیمار معاشرے کو بڑی وافر مقدار میں آکسیجن اور فی کس مسکراہٹیں عطا کی ہیں۔'' (15)

انور سدید کے اسلوب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کے ہاں متضاد کیفیات کو ایک ہی جملے میں سمونے کا انداز خاصا دلچسپ ہے۔ وہ دو متضاد صورتوں کو اس طرح ایک جگہ اکٹھا کر دیتے ہیں کہ ان میں سے خامی، خوبی کے سامنے ہیچ نظر آنے لگتی ہے۔ وہ کسی شخصیت کی کسی خامی کو خوبی کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں قاری کو اس کی خامی پر اعتراض ہونے نہیں پاتا اور وہ اسے طبیعت یا مزاج سمجھنے لگتا ہے۔ وہ شان الحق حقی کے خاکے میں رقمطراز ہیں:

''شان الحق حقی کے کردار کے دو زاویے بڑے دلچسپ ہیں۔ ادبی امور میں وہ ایک ہوش مند اور زیرک ادیب تھے لیکن نجی زندگی میں وہ بلا کے بھلکڑ تھے۔''(16)

انور سدید نے شان الحق حقی کی بھولنے کی عادت کو خوب صورتی سے بیان کیا ہے کہ یہ ان کی خامی ہونے کے باوجود ان کے ادبی کارناموں اور ادبی شخصیت کے نیچے دب کر رہ گئی ہے۔ اس طرح ان کے ادبی مقام و مرتبے میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ خاکہ نگار کا بہت بڑا فن ہوتا ہے جس سے انور سدید مالا مال تھے۔

انور سدید نے جن لوگوں کے خاکے لکھے ہیں وہ خاصے معروف لوگ تھے اور اپنے اپنے فن میں خاص اہمیت کے حامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں لکھتے ہوئے انھوں نے ان کے ادبی مقام و مرتبے کا بھی خاص خیال رکھا ہے اور ان کی شخصیت کو ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے بھی جانچنے کی کوشش کی ہے، لیکن بعض ایسی شخصیات کے بھی خاکے لکھے ہیں جو سماجی حوالے سے اپنا خاص مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے ان کے خاکے لکھتے وقت انھوں نے ایسا اسلوب اختیار کیا ہے کہ ایک طرف ایسے لوگوں کے سماجی مرتبے اور بزرگی کو نمایاں کرتے چلے گئے ہیں۔ وہ جس جگہ اخیر عمر میں بسیرا کیے بیٹھے تھے وہاں سے ان کی ایک طبعی مناسبت بھی سامنے آنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے والد کا خاکہ انور سدید نے لکھا۔ ۸۸ برس کے اس بزرگ کا خاکہ لکھتے وقت انور سدید نے ان کے سماجی مرتبے اور بزرگی کے اعتراف کو یوں عقیدت مندی کے ساتھ موزوں اسلوب میں ڈھالا کہ قاری کے سامنے پورا منظر نامہ اپنے آپ کو عیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ انور سدید لکھتے ہیں:

'' ۸۸ برس کے ایک معمر بزرگ جنھوں نے زندگی کے ہزاروں جوار بھاٹے سر کیے تھے اور جن کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت تھی ایک بوڑھے جہاں دیدہ برگر کے نیچے کھاٹ پر براجمان تھے۔ میں حیران تھا کہ ان کی وضع قطع میں روایتی جوگیوں والی کوئی بات نہیں تھی نہ گیروے کپڑے نہ لمبی لمبی خاک آلود جٹائیں، نہ راکھ کی دھونی لیکن ان کے چہرے پر بے پایاں طمانیت اور بے دریغ شانتی تھی۔''(17)

انور سدید کی اکیسویں صدی میں خاکہ نگاری ایک منفرد اسلوب بیان کی حامل ہے۔ انھوں نے ان خاکوں میں ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جو ایک طرف تو مختلف شخصیات سے حقیقی آگاہی دلاتا ہے تو دوسری طرف اکیسویں صدی میں خاکہ نگاری کے اسلوب کو نئی جہتوں سے بھی روشناس کراتا ہے۔

اکیسویں صدی میں خاکہ نگاری کو ایک نیا اور منفرد اسلوب عطا کرنے والے اہم خاکہ نگار ڈاکٹر انوار احمد ہیں۔ انوار احمد نے خاکہ نگاری میں اسلوب کے حوالے سے ایک منفرد انداز اختیار کیا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے خاکے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو اسلوب پر گرفت حاصل ہے وہ بات سے بات پیدا کرنے میں اچھی مہارت رکھتے

ہیں۔ وہ شخصیت کے احوال اور اس کی سیرت کو بیان کرنے میں شگفتہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ ان کے خاکے اسلوب کی بنا پر قاری کو اپنے سحر میں لے لیتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں بھی تشبیہات کا استعمال ہوا ہے۔ انھوں نے مختلف لوگوں کے احوال بیان کرتے ہوئے تشبیہات استعمال کی ہیں وہ انہیں اردو کے خاکہ نگاروں میں شامل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اسلوب کو بھی جاندار اور دلکش بناتی ہیں۔ ان کے خاکوں میں تشبیہات سے پیدا ہونے والی دلکشی ملاحظہ ہو۔ ان کے بقول:

"وہ شادی شدہ تھا، اس لیے ہماری طرح کی جنسی قحط زدگی کے آثار اس کے چہرے پر یا آنکھوں میں نہیں تھے۔"(18)

انوار احمد نے مختلف شخصیات کے خاکوں میں ان کے علمی و ادبی کارناموں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اگر شخصیت شاعر ہے یا کسی شاعر کا ذکر ہو رہا ہے تو بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے شعر سے بھی کام لیا ہے۔ ان کا یہ شعر سید محسن نقوی کے خاکے میں بھی درج ہے:

ہماری لاش پہ ڈھونڈو نہ انگلیوں کے نشاں
ہمیں خبر ہے عزیزو یہ کام کس کا ہے (19)

انوار احمد کی خاکہ نگاری کا اسلوب خاصا رواں ہے بلکہ اگر کہا جائے کہ روانی ان کے اسلوب کی اہم خوبی ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ اس روانی کی بڑی وجہ ان کا شگفتہ مزاج ہونا ہے۔ وہ بڑی سے بڑی بات کو آسانی سے چٹکلوں میں کہہ جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں وہ مختلف چیزوں کی اہمیت ایک دوسرے سے تقابل کے حوالے سے بھی واضح کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال مہر گُل محمد کے خاکے میں ملتی ہے۔ وہ خاکے کا آغاز ہی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ملتان شہر کی منہدم ہوتی نشانیوں میں، میں نے آخر آخر دو چیزوں کو اپنی زندگی تک کے لیے پائیدار خیال کر لیا تھا، ایک دمدمہ اور دوسرے مہر گُل محمد۔"(20)

اکیسویں صدی میں اردو خاکہ نگاری کے اسلوب اور فن کے تناظر میں عرفان جاوید کی خاکہ نگاری کا مطالعہ کریں تو ان کی خاکہ نگاری میں اسلوب کے حوالے سے خاصی تسلی بخش صورت حال ملتی ہے۔ عرفان جاوید کی خاکہ نگاری کے اسلوب میں تشبیہات کا عمل دخل ملتا ہے۔ عرفان جاوید ایک تعلیم یافتہ شخص ہیں اور مطالعہ کے بے حد شوقین ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں الفاظ کی کوئی کمی نہیں۔ وہ تشبیہات بھی ایسی استعمال کرتے ہیں جو تحریر میں دلکشی اور اور تاثیر پیدا کرتی ہیں۔ ان کے ہاں چیزوں کو ایک خاص انداز میں دیکھنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ وہ مختلف لوگوں کی مختلف عادات کو تشبیہات اور استعارات سے یوں مزین کرتے چلے جاتے ہیں کہ قاری ان کی تحریر کے اسلوب کے سحر میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ وہ تشبیہ دیتے وقت مشبہ اور مشبہ بہ کی مشابہت کو تاثیری حوالے سے بھی دیکھنے کے عادی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی استعمال کی ہوئی تشبیہات میں ایک خاص قسم کی روانی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ وہ تشبیہاتی انداز میں منظر کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"ان کی سون سکیسر سے جذباتی وابستگی تحریروں اور گفتگو پر غالب رہی۔ لہلہاتے کھیت، امڈتے بادل، دھلی پہاڑیاں، چکراتی بل کھاتی پگ ڈنڈیاں، بیکڑ کے پھول کی جڑ میں مٹھاس کا موتی، چٹختی چٹانوں کی دراڑوں سے پھوٹتے جنگلی پھول، گھنی پھلاہیوں کے سائے میں دھرتی کی بھینی بھینی خوشبو، نیلے پہاڑ کے دامن میں آئینے کی طرح چمکتی ہوئی جھیل پر سورج کی کرنوں کی سڑک، بادل کی گرج کے ساتھ تانبے کی چادروں کی طرح بجتے ہوئے پہاڑ، مکئی کے بھٹوں کے لانبے لانبے سنہرے بالوں میں مکئی کی مہک، رات کے سناٹے میں اونٹ کی گھنٹی یا خچر کے ٹاپ، مینہ کے چھینٹے، موسلا دھار بارش کی عمودی دیواریں اور سیاہ بادلوں سے بجلی کے لشکارے اُن کی تحریروں میں دَر آتے ہیں۔" (21)

اردو خاکہ نگاری میں اکیسویں صدی میں اسلوب کی سطح پر عرفان جاوید نے بھی تشبیہات سے کام لیا ہے۔انھوں نے تشبیہات کے ذریعے پورا منظر نامہ بیان کر کے تشبیہ پر گرفت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی استعمال کی ہوئی تشبیہات میں روانی ہے جو ان کے اسلوب کو جولانی بخشتی ہے اور زیر بحث شخصیت سے قاری کو متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

تشبیہات کے ساتھ ساتھ عرفان جاوید کی خاکہ نگاری کے اسلوب کا ایک اہم وصف ان کا خاکہ شروع کرنے کا منفرد انداز ہے۔وہ خاکہ کا آغاز اس انداز میں کرتے ہیں قاری اس کے سحر میں کھو جاتا ہے اور اس میں تجسس پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس کی ایک مثال مستنصر حسین تارڑ کے خاکے سے ملتی ہے جہاں وہ آغاز میں ہی قاری کو کہیں ماضی کی سیر کروانے لگتے ہیں:

''میں چھوٹا سا بچہ تھا تو صبح سویرے کی تازہ نیم سرد ہوا میں ورانڈے میں بیٹھے دادا جی کی گود میں چڑھ آتا تھا۔ تازہ غسل کے بعد اُن سے ولایتی صابن، ٹیلکم پاؤڈر اور اولڈ سپائس آفٹر شیو لوشن کی مہک آیا کرتی تھی۔ وہ مجھے اپنی گود میں بٹھا کر، سامنے سڑک سے گزرتی اِکا دُکا رینالٹ، والکس ویگن، مورس گاڑیوں، آسمانی رنگ کے ویسپا سکوٹروں، گھنٹی کی جل ترنگ میں خراماں سائکلوں کی میکانکی موسیقی میں گھلتی ملتی چھاؤنی کے قدیم برگد کے چھتناور درختوں میں کُوکتے پرندوں، نیم کے درختوں سے گرتے نیم کے پیلے پکے پھل کی تھک تھک درختوں سے جامن کے گرنے کی ہلکی ٹپ ٹپ اور انگور کی بیلوں میں چھپی چھوٹی رنگین چڑیوں کی چہکار میں گھلتی ملتی کہانیاں

سُنایا کرتے۔ اُن کی سُنائی کہانیاں، کہانیاں کم اور اُن کے وطن امرت سر،
جسے وہ امبر سر کہتے تھے، کے قصّے زیادہ ہوتے۔ اُن کی زبانی ماضی کی تصوراتی
عینک سے دیکھا گیا امبر سر کوئی جادوئی شہر لگتا تھا جہاں امرت کے چشمے
بہتے، سونے میں ڈھلا سورج سنہری شعائیں بکھیرتا، ٹھنڈے ٹھار میٹھے پانی
کے کنویں اپنی گہرائیوں میں برف آب، آبِ حیات کا خزانہ رکھتے۔"[22]

عرفان جاوید نے اسلوب میں لوگوں کے جذبات واحساسات کو نمایاں کرنے میں کئی طریقے اپنائے ہیں۔ اور لوگوں کو یادوں کے سہارے زندہ رہنا بھی سکھاتے ہیں۔ وہ ہجرت کے واقعات کے بیان میں لوگوں کی نفسیات کا بخوبی تجزیہ کرتے ہوئے ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں کہ گویا لوگ ان کے سامنے بے یارومددگار بیٹھے ہیں اور ایک گانے کی آواز پر کس طرح وطن کی یاد آنسو رلاتی ہے، عرفان جاوید کے لکھے ہوئے خاکے سے ملاحظہ ہو:

"اُن کے گزر جانے کے بعد ایک مرتبہ میں اُن کے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا
اُنھیں یاد کر رہا تھا تو بتایا گیا کہ 'کابلی والا' فلم میں مناڈے کا گانا
اے میرے پیارے وطن
اے میرے بچھڑے وطن
تجھ پہ دل قربان
سن کر امرت سر کو یاد کر کے اُن کی آنکھوں میں حقیقی آنسو آجاتے
تھے۔"[23]

اکیسویں صدی کی خاکہ نگاری کی روایت کا اسلوبیاتی مطالعہ کرتے ہوئے جب محمود عزیز کے لکھے ہوئے خاکوں کو دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے خاکے بھی اسلوب کے حوالے سے خاصے کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ انھوں نے خاکوں میں جو اسلوب برتا ہے وہ حقیقی اسلوب ہے جو ان کی شخصیت اور ان کے ماحول سے میل کھاتا ہے۔ اسلوب دراصل ہر ادیب و قلم کار کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اسلوب جتنا نکھا ہوا دل کش سلیس اور بے تکلف ہوگا اتنا ہی ادیب کی پروقار متین و سنجیدہ شخصیت اور ادبی ذوق کو بھی ظاہر کرے گا۔

محمود عزیز نے شگفتہ اسلوب، دلچسپ واقعات اور صاف ستھری زبان سے اپنی تحریروں میں جان ڈالی ہے اور زندگی کے واقعات کو منطقی ترتیب سے لکھتے چلے گئے۔ وہ ڈاکٹر محمد معین قریشی کے اسلوب کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اتنی زیادہ معلومات اور اتنے بہت سے واقعات کو اکٹھا کرنا، انھیں ایک
منطقی انداز میں ترتیب دینا اور پھر آسان رواں اور شستہ انداز میں پیش کرنا
ایک کارِدارد تھا جس پر وہ پورے اترے"۔[24]

محمود عزیز نے خاکوں میں اُس عہد کی تہذیب، زبان و بیان، ثقافت اور کھیل کو بھی بیان کیا ہے۔ اور واقعات ایسے دیئے کہ جو نوجوان نسل کے لیے روشنی اور عبرت کے کئی پہلو رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب پڑھتے وقت کہیں بھی بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا کیوں کہ مصنف حالات کی کڑی سے کڑی ملاتے چلے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِن کے پاس لکھنے کو تو بہت کچھ تھا لیکن انھوں نے صرف اسی پر اکتفا کیا۔ ممتاز احمد خان دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"محمود عزیز کا اسلوب شائستہ اور سلیس ہے جو ابہام سے علاقہ نہیں رکھتا"۔[25]

محمود عزیز کے خاکے پڑھتے ہوئے کہیں بھی مشکلات درپیش نہیں ہوتیں کیوں کہ اُن کی تحریروں میں ابہام نہیں۔ محمود عزیز دلی کے تھے۔ اُن کے اسلوب میں دلی کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ بعض جگہوں پر ہندی الفاظ بھی شامل ہیں۔ وہ "دلی کی چند عجیب ہستیاں" میں لکھتے ہیں:

> "صبوحی صاحب شاہی کے اُجڑنے پر اچھے وقتوں میں گزر اوقات کی سہولتوں، ارزانی، روٹی کپڑا اور مکان کی بہم رسانی کے سمے کو یاد کرتے ہیں اور دلی والوں کے رہن سہن اور اس وقت کے معاشی حالات کی جھلکیاں دکھاتے ہیں"۔[26]

محمود عزیز کا اسلوب خاکہ نگاری کے روایتی اسلوب میں تبدیلی لاتا ہے اور روایت سے انسلاک بھی سامنے لاتا ہے۔ صبوحی صاحب کا خاکہ "دلی کی چند عجیب ہستیاں" میں بیان کیا گیا ہے جس میں دلی میں تہذیب کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ محمود عزیز نے کہیں کہیں ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ صبوحی صاحب کے بارے میں لکھتے ہوئے "سمے" کا لفظ استعمال کیا جو کہ ہندی لفظ ہے۔ ان کے زبان و بیان میں دلی کا رنگ جھلکتا ہے۔ وہ خود دلی والے اور یگانہ روزگار گفتار و کردار میں بھی منفرد ہیں۔ اِن کے اسلوب میں دہلی کی ٹیکسالی زبان نظر آتی ہے۔ وہ نواب تاباں کے خاکے میں لکھتے ہیں:

"شبلی بھی ذرا مدمغ آدمی تھے، خاموش بیٹھے سنتے رہے تاباں نے دیکھا تو چمک کر بولے "ہاں صاحب' یہ شعر غور طلب ہے اور غزل کا اگلا شعر سنایا، مولانا نے فرمایا سبحان اللہ خوب شعر کہا ہے آپ نے"۔ بس پھر تاباں آئیں تو جائیں کہاں؟ بگڑ کر بولے ابے لنگڑے میں نے تو یہ شعر تین دن میں کہا اور تو نے اسے ایک منٹ میں سمجھ لیا، بیٹا یہ شعر العجم نباشد۔ اس کے بعد ان کی گالیوں کا پٹارہ کھل گیا اور مولانا شبلی کو اپنا پنڈ چھڑانا مشکل ہو گیا"۔[27]

محمود عزیز کے خاکوں میں دلی کا رنگ نمایاں جھلکتا ہے۔ انھوں نے ہندی کے ساتھ ساتھ فارسی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے خاکے اردو خاکہ نگاری میں اسلوب اور فن کے حوالے سے نئی جہتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں زبان کا استعمال منفرد انداز میں ہوا ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "ابے لنگڑے، بگڑ، چمک کر بولے" جیسے الفاظ کا استعمال کیا جو کہ دلی میں بھی عام بولے جاتے تھے۔ "شعر العجم نباشد" فارسی کے الفاظ ہیں۔ محمود عزیز نے فارسی الفاظ کا استعمال بھی بے دھڑک کیا۔"[28]

محمود عزیز کا اسلوب دلی میں بولی جانے والی زبان کے اسلوب جیسا ہے اس لیے محاورات کا استعمال جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ محاورہ زبان اور بول چال کا اہم جزو ہے۔ ہم روز مرہ کی گفتگو کے دوران مختلف محاورات کا استعمال کرتے ہیں جو بات میں وزن پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ معنوی سطح پر بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ دلی میں لوگ جملے میں دو چار محاورے ضرور بولتے تھے اس لیے اِن کی زبان میں بھی یہ رنگ آ گیا ہے۔ اس ضمن میں کچھ مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ وہ ''دلی کی یادگار ہستی'' میں لکھتے ہیں:

> ''میاں صاحب زادے یہ لوگ تو سب اُلّو کے پٹھے ہیں۔ ہم تو خود انفرادیت کے پرستار ہیں اور ہم تو ہمیشہ سے اس بات کے قائل چلے آئے ہیں کہ فرد کی ہر خواہش کی تکمیل کی راہ میں جو شے بھی حائل ہو اسے پاش پاش کر دینا چاہیئے۔ اب دیکھو تم ہمارے سامنے بیٹھے ہو بس جی چاہتا ہے کہ تمھاری آنکھوں کا سُرمہ بن جائیں اور تمھیں اُٹھا کر کلیجے میں رکھ لیں''۔ (29)

محمود عزیز نے خاکہ نگاری کے دوران میں عام بول چال سے آگے بڑھتے ہوئے مختلف شخصیات کے ذاتی خصائص کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ان خصائص میں وہ تصوف اور دیگر باطنی خصائص کو اہمیت دیتے نظر آتے ہیں۔ ایک خاکہ میں وہ لکھتے ہیں:

> "انھوں نے تصوف و عرفان کے مسائل ایسے دلچسپ اور دلکش انداز میں بیان کیے کہ لوگوں نے اِن کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیے۔ اور اِن کی آواز ہمہ تن گوش ہو گئے۔"(30)

دہلی میں لوگ عام گھریلو بول چال میں بھی ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے محاورے بولتے تھے اس لیے انھوں نے کہیں بھی محاوروں کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ انھوں نے محاورات سے خاکہ میں لطف پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

محمود عزیز نے اپنے خاکوں میں دلی کی تہذیب کو اجاگر کیا ہے۔ اپنے خاکوں میں دہلویت کی نشانی دلی والوے کی مزہ دہانی کا بھی ذکر کیا۔ انھوں نے تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ من پسند پکوانوں کا بھی خوش آئند طریقے سے بیان کیا ہے۔

مجموعی طور پر اکیسویں صدی میں اردو خاکہ نگاری میں فکری اور موضوعاتی حوالے سے تنوع کے ساتھ ساتھ اسلوب اور فن کی سطح پر بھی خاصا تنوع واقع ہوا ہے۔ خاکہ نگاروں نے اسلوب میں کئی نئے تجربے بھی کیے ہیں اس کے ساتھ ساتھ خاکہ نگاری کے روایتی اسلوب کی پیروی بھی کئی خاکہ نگاروں کے ہاں ملتی ہے۔ اس صدی میں اسلوبیاتی اور فنی حوالے سے اردو خاکہ نگاری میں جو تبدیلیاں سامنے آئی ہیں ان سے خاکہ نگاری کی صنف کو جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، لاہور: اساطیر پبلی کیشنز، 2002ء، ص:137

2۔ ایضاً،، ص:159

3۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2006ء، ص:83

4۔ ایضاً،، ص:100

5۔ ایضاً،، ص:145

6۔ ایضاً،، ص:111

7۔ ایضاً، ص187

8۔ا یضاً،، ص:39

9۔ا یضاً،، ص:107

10۔ ایضاً، ص:107

11۔ عامر سہیل، میرے ہم سفر، مشمولہ، احمد ندیم قاسمی: شخصیت و فن، از ڈاکٹر ناہید قاسمی، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، 2009، ص:188

12۔ انور سدید، ڈاکٹر 'سعید صورتیں، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 2009ء، ص:72

13۔ انور سدید، ڈاکٹر، نقوش رفتگاں، لاہور: کلاسیک، 2010ء، ص:7

14۔ ایضاً، ۰۲، ص:121

15۔ ایضاً، ص:107

16۔ ایضاً،، ص:239

17۔ انوار احمد، ڈاکٹر، یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ، فیصل آباد: مثال پبلشرز، 2015، ص:93

18۔ ایضاً،، ص:92

19۔ ایضاً،، ص:163

20۔ عرفان جاوید، دروازے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2006ء، ص:10

21۔ ایضاً،، ص:32

22۔ ایضاً،، ص:46

23۔ محمود عزیز، ذکر کچھ دلی والوں کا، کراچی: بقائی یونی ورسٹی پریس، 2017، ص:45

24۔ ممتاز احمد خان، دیباچہ ذکر کچھ دلی والوں کا، از محمود عزیز، ص:6

25۔ محمود عزیز، ذکر کچھ دلی والوں کا،، ص:56

26۔ ایضاً، ص:211

27۔ ایضاً،، ص:118

28۔ ایضاً،، ص:27

29۔ ایضاً،، ص:42